بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج جب کہ میں یہ اشارات لکھنے بیٹھا ہوں، ماہ محرّم کا آغاز ہے جس کی پہلی تاریخ کو سیّدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت واقع ہوئی، اور یہی ماہ محرّم ہے جس کے عشرۂ اوّل کا اختتام حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت سے ہوا۔ حضرت سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ دوسرے خلیفۂ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا کام حسن و خوبی سے چلاتے ہوئے ابولولو فیروز نامی ایک مجوسی کے جذبۂ انتقام (جس کے پیچھے ایک سازش کا سراغ بھی ملتا ہے) کا ہدف بن گئے۔ یہ واقعہ انتہائی درد انگیز ہے اور اس کی یاد تازہ رہنی چاہیے۔ مگر امام حسین رضی اللہ عنہ کو دوسری ہی نوعیت کا مقام ملا۔ یعنی جب کاروبارِ سیاست و حکومت کی گاڑی کو خلافت علیٰ منہاجِ نبوت سے ہٹا کر قیصروی و کسروی بادشاہت جبر کے راستے پر ڈال دیا گیا تو اس تیز رو گاڑی کو روکنے کے لیے امام حسین رضی اللہ عنہ اس سے بے پروا ہو کر سامنے جا کھڑے ہوئے کہ دونوں طرف قوت کا تناسب کیا ہے۔ اس لحاظ سے واقعۂ کربلا ایک خاص اہمیت کا حامل ہے اور مسلمان اس واقعہ کی یاد بڑے پُرجوش طریق سے تازہ کرتے ہیں۔

یاد تو تازہ کی جاتی رہتی ہے، مگر آہستہ آہستہ یہ تصوّر گم ہوتا گیا کہ ہم کس بات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

وہ قومیں بڑی خوش نصیب ہوتی ہیں، جو اپنی تہذیبی شناخت سے محروم نہیں ہوتیں جن کی تاریخ رزمِ خیر و شر کی آئینہ دار ہوتی ہے اور جن کے بنیادی عقیدوں اور مقاصد کو شاداب کرنے

کے لیے شہادت کی گھٹائیں وقتاً فوقتاً اُٹھ کر خون کی برکھا لاتی رہتی ہیں اور خیال و خُلق کی جڑیں بار بار سرسبز ہوکر نئے شگوفے چھوڑتی اور نئے برگ و بار سے آراستہ ہوتی ہیں۔

اگر کسی گروہِ انسانی کی تاریخ کا تمام تر سرمایہ فاتحین کی جنگوں، کمزوروں پر چڑھائیوں، بادشاہوں کے جاہ و جلال کے مظاہروں، درباریوں کی سازباز کی روئیدادوں اور ان کے ساتھ کچھ اتفاقی حادثات و تغیرات کا ریکارڈ ہو تو ایسی قوموں کی نہ ایمانی و اخلاقی بنیادیں ہوتی ہیں اور نہ اُن کے ہاں انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو جگمگاہٹ ملتی ہے۔ جن قوموں کی داستانیں فقط لوٹ مار اور مفاد کے ٹکراؤ کی داستانیں ہوں اور جن کے ماضی و حال کا سارا تانا بانا نسلیت اور وطنیت کے تاروں سے بُنا ہو ان کی تہذیب، دولت، سامانِ تعیش، لذتی ثقافت، جنسی جنون اور ان کے تحفظ کے لیے سامانِ جنگ کی ترقیات سے عبارت ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تعلیم، علم، ادب، صحافت فنون، سائنس اور ٹکنالوجی کی تمام تر ترقیات بھی متذکرہ اغراض کے لیے مطلوب ہوتی ہیں۔

ہم مسلمان، بہ حیثیت ایک عالمگیر ملّت کے اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ہزار تباہیوں اور پستیوں کے باوجود ہمارے ایمانی وجود اور ہماری تہذیبی ہستی کی جڑیں سلامت و سرسبز ہیں، جو نیا آفات زمہریری موسم اور لُو کے جھکڑوں میں بھی نئی کونپلیں نکال لیتی ہیں۔ یہ جڑیں اسی لیے سرسبز ہیں کہ ہمارے اندر ایک مفاد پرست قوم اور ایک اخلاقی تہذیب کی امانت دار قوم ہونے کا احساس باقی ہے یہ احساس اس لیے باقی ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے اُمت کے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے جس طرح اپنا خون پیش کیا تھا، اسی طرح امام مالکؒ، حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے بھی قربانیاں دیں۔ اور پھر قریب کی تاریخ میں وسط ایشیا کے مسلمانوں کی جانبازیاں، مغربی امپریلزم کے مقابلے میں عرب اور مسلم افریقی علاقوں کی تحریکوں کے کارنامے، خود برصغیر میں تحریک مجاہدین اور ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کے شہدا و ستم رسیدگان کا ایثارِ عظیم، مصر، سوڈان اور شام میں اخوان المسلمون کی سرفروشیاں یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اور ان پچھلے واقعات کا شعور ہمارے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ سلسلہ قیامت تک ٹوٹنے نہ پائے۔

محرم میں امام حسینؓ اور کربلا کی داستان کی تفصیلات مختلف نقطۂ نظر سے لکھی بھی جائیں گی اور مجالس میں سُنائی بھی جائیں گی۔ طرح طرح کے محرکات اور مقاصد بیان کیے جائیں گے۔ ہم پوری کہانی کو یہاں عرض نہیں کر رہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ امام کے اپنے ہی ارشادات سے جو کچھ سبق ملتا ہے وہ اخذ کیا جائے۔

سب سے مختصر لفظوں میں امامؓ نے اپنا مقصد عبداللہ بن مطیع کے سامنے بطنِ رملہ سے کچھ آگے جا کر بیان کیا۔ عبداللہ نے پوچھا:

"آپ حرم سے کیوں نکلے؟"

جواب دیا:

"کوفہ والوں نے بُلایا ہے کہ معالمِ حق کو زندہ کیا جائے اور بدعتوں کو مٹایا جائے۔"

یعنی دین کی اصل سچائیاں اور معروفات قائم کیے جائیں اور بدعات (مخالفِ سنّت طریقوں) کو ختم کیا جائے۔ ان الفاظ سے مراد وہی کچھ ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قرآنی تقاضے سے ہے۔ یہ فریضہ ہر مومن و مسلم اور بہ حیثیت مجموعی پوری اُمت اور اس اُمت سے تعلق رکھنے والے ہر ادارے اور گروہ پر عاید ہوتا ہے۔

اس فریضہ کے مختلف مدارج ہیں، زبانی دعوت سے لے کر جہاد تک کے سارے مراحل کو یہ محیط ہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنا کہ کیسا منکر سامنے ہے؟ اس کے ازالے کی کیا صورت ممکن ہے؟ اور کسی خاص قسم کی صورتِ حالات میں کیا اقدام کرنا چاہیے؟ ان سارے سوالات کا فیصلہ اُس فرد یا گروہ کو کرنا پڑتا ہے جو ایک خاص سلسلۂ تاریخ کی راہ پر چلتا ہوا، کسی خاص طرح کے احوال و ظروف میں گھر جائے۔ ایسے کسی لمحے کا تقاضا بسا اوقات اعلیٰ درجے کی عزیمت ہوتا ہے۔ اور عزیمت کے تقاضوں سے کترا کر نکل جانے سے عامۃ الناس کے ایمان و ضمیر ٹھٹھر جاتے ہیں۔ اور خودی کا اُبھار ختم ہو جاتا ہے۔

یہ واضح ہے کہ امام حسینؓ (کوفہ والوں کی "کوفیت" سے آگاہ ہونے کے بعد) لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے واپس ہونا چاہا، انہوں نے سرحدوں کی طرف نکل جانے کی خواہش کی، انہوں نے یزید کے سامنے جا کر بالمشافہ بات کرنے کا عندیہ ظاہر کیا، مگر ان کو معاند قوتوں نے

چاروں طرف سے گھیر کر اور مجبور کر کے مقامِ جنگ تک پہنچا دیا۔ اب ایک ہی شرطِ نجات باقی رکھی گئی کہ یزید کی حکومت کے حق میں بیعت فرمالیں۔ حضرت امامؓ جن کے ساتھ اہل وعیال تھے یا چند گنے چنے دیوانے، انہوں نے اس شرطِ نجات کو قبول کرنے کے بجائے کثیر التعداد دشمنوں کے تیروں اور نیزوں کا اپنے آپ کو اور اپنے مختصر سے قافلے کو نشانہ بننے کے لیے پیش کر دیا، مگر قلتِ قوت کے باوجود آخری سانس تک جہاد کی بازی مردانہ وار کھیلے۔

ایسے چیلنج کے سامنے آنے کے بعد اگر معاملہ ذرا بھی دب کر کیا جاتا تو اُس وقت معاشرے پر بُرے اثرات پڑتے، ان کے علاوہ اُمت کی نسلیں ایک قابلِ فخر تاریخی میراث سے محروم رہ جاتیں۔

امامؓ کے سامنے دراصل وہ بُرے اثرات تھے جو سبائی، مجوسی اور یہودی سازشوں، مسلمانوں کی داخلی آویزشوں، بیعت بہ زور و زر اور بادشاہتی مظالم کی وجہ سے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ اور جن کی وجہ سے ضمیر خوف اور مفاد کے دوہرے بوجھ تلے دب گئے تھے۔ امامؓ نے آخری بازی کھیلنے کا فیصلہ غالباً اس لیے کیا کہ مسخ ہو جانے والے ضمیروں میں آئندہ زندگی کروٹ لے سکے۔

بہرحال مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تھا۔

بطنِ عقبہ سے گزر کر جب قافلہ شراف میں اُترا تو وہاں حکومت کی طرف سے حُر بن تمیمی بھی ایک ہزار سواروں کے ساتھ پہنچا۔ قیام کے بعد جب وہاں سے امام کا قافلہ آگے روانہ ہونے لگا تو امام حسینؓ نے یہ باتیں کہیں:

"ہم اہل بیت خلافت کے ان دعوے داروں کے مقابلے میں، جنہیں اس کا کوئی استحقاق نہیں اور جو تم پر ظلم و زیادتی کے ساتھ حکومت کرتے ہیں، خلافت کے حقیقی مستحق ہیں۔"

اس کلام میں پہلی اہم بات یہ ہے کہ حضرت امام حکومت کے اسی طرزِ خلافت کے علمبردار تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر نئے دَورِ انحراف سے پہلے تک چلتا رہا تھا۔ کم سے کم

یہاں کسی جداگانہ قسم کے نظامِ امامت کی بات سامنے نہیں آتی۔

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اگرچہ امام حسینؓ گفتگو میں یہ کہتے ہیں کہ ہم اہلِ بیت خلافت کے زیادہ مستحق ہیں، لیکن یہاں اہلِ بیت ہونے کا تذکرہ وہ بطورِ اپنے ایک ایمانی و اخلاقی اعزاز کے کر رہے ہیں، نہ یہ کہ اسے دلیلِ استحقاق قرار دیا۔ اگر امام اپنے "اہل بیت" ہونے کو دلیلِ استحقاق قرار دیتے تو خلافت کے غیر مستحق دعوے داروں کے بارے میں بجائے یہ بات کہنے کے "جو تم پر ظلم و زیادتی کے ساتھ حکومت کرتے ہیں" زیادہ قرینِ حقیقت یہ کہنا ہوتا کہ وہ لوگ اہلِ بیت میں سے نہیں ہیں۔ امامؓ نے اصل چیز یہ واضح کی کہ آج کے نام نہاد مدعیانِ خلافت تم پر ظلم و زیادتی سے حکومت کر رہے ہیں، ان کے بجائے اگر حکومت ہمارے ہاتھ میں ہوتی تو عدل و رحمت کا صدور ہوتا۔

اس ارشاد میں یہ نظریہ بھی شامل ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ظلم و زیادتی کرنے والوں کو حکومت کرنے کا استحقاق نہیں ہے۔

یوں تو عربوں میں یہ روایت بھی تھی کہ مخالفوں کے سامنے اپنے ذاتی یا خاندانی فضائل بیان کرتے تھے۔ پھر حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شورش پسندوں سے آخر میں جو خطاب کیا اس میں انہوں نے بھی اپنے دینی مرتبے کا اور خدمات کا انہیں احساس دلایا۔ یہ چیز بر بنائے مفاخرت نہ تھی بلکہ اپیل کے طور پر تھی۔ امام حسینؓ نے بھی مخالفین کے اچھے جذبات کو اپیل کے ذریعے متحرک کرنے کی کوشش کی۔

یہ نہ مانا جائے تو پھر امامؓ کے متعلق گویا تاثر یہ ہوا کہ وہ موروثی اقتدار کے نظریے کے علمبردار تھے۔ حاشا وکلّا ایسا نہیں تھا۔

بعد میں اسی اپیل کے انداز سے شبِ عاشورہ گزرنے پر صبح کو دُعا کرنے کے بعد دشمنوں کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے کلام کیا۔ فرمایا:

"لوگو! میرے نسب پر غور کرو، میں کون ہوں، پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر اپنے آپ کو ملامت کرو۔ خیال کرو کہ میرا قتل اور میری آبرو ریزی یعنی میری

عزت پر حملہ کرنا، تمہارے لیے زیبا ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کی بیٹی کا لڑکا نہیں ہوں اور اس کے وصی ابن عم، خدا پر سب سے پہلے ایمان لانے والے، اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا سید الشہدا حمزہؓ اور جعفر طیار میرے چچا نہ تھے؟ کیا تم کو نہیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اور میرے بھائی کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں"۔

اور یہ بھی فرمایا:

"مجھے بتاؤ کہ تم لوگ میرے خون کے کیوں خواستگار ہو؟ کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے؟ کیا کسی کا مال ضائع کیا ہے؟ کسی کو زخمی کیا ہے؟

اُوپر کی عبارت پر غور کریں، اس میں اپنے نسبی وحسبی مرتبے کے بیان کا صاف مقصد یہ احساس دلانا ہے کہ میں کوئی ایسا آدمی نہیں جو یکایک زمین سے نکل آیا ہو۔ پردیس سے یہاں آ داخل ہوا ہو، کسی غار سے پہلی مرتبہ نمودار ہوا ہو، جس کا کوئی مقام عزت نہ ہو، جو اسلامی معاشرے کے کسی گوشے میں گمنامی میں پڑا رہا ہو، جسے تربیت کے لیے اچھا خاندانی ماحول نہ ملا ہو، جس کی پہلے سے کوئی قدر وقیمت نہ ہو۔ بخلاف اس کے میں خانوادۂ نبوت کا پروردہ وہ نوجوان ہوں جس کی فضیلت احادیث میں وارد ہے۔ چاہیے تھا کہ تم مجھے پہچانتے اور میرا پیغام سمجھتے۔ اگر یہ نہیں تو اتنا تو تمہیں سوچنا چاہیے کہ میرا قتل اور میری عزت پر حملہ کرنا تمہارے لیے کسی طرح جائز نہیں ہے۔ یہ چیز تب جائز ہوتی کہ میں کوئی قتل کرتا، کسی کا مال ضائع کرتا یا کسی کو زخم لگاتا۔ میرا ایسا کوئی جرم نہیں ہے تو پھر تمہارا یہ عناد کیا جواز رکھتا ہے؟

یہاں نہ تو نسب کو اور خاندان کو مطالبۂ اقتدار کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور نہ فخر وغرور کے کسی اظہار کے لیے۔ بعض ہستیوں کی عظمتیں اتنی نمایاں ہوتی ہیں کہ انہیں اپنے قدر بڑھانے کے لیے کبھی ان کو اپنی زبان سے بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں مقصد حکومتی لشکر کے عوام کے فکر اور جذبات کو اپیل کر کے متحرک کرنا مقصود ہے۔

مقام بیضہ پر حضرت امام نے ایک اور پُرجوش خطاب کیا۔ فرمایا:۔

"لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ظالم، محرماتِ الٰہی کو حلال کرنے والے، خدا کے عہد کو توڑنے والے، سنّتِ رسولؐ کے مخالف اور خدا کے بندوں پر گناہ اور زیادتی سے حکومت کرنے والے بادشاہ کو دیکھا۔ اور اُس کو قولاً اور عملاً غیرت نہ آئی تو خدا کو حق ہے کہ اُس کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کرے۔ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی ہے۔ مُلک میں فساد پھیلایا ہے۔ حدودِ الٰہی کو بے کار (یعنی معطّل) کر دیا ہے۔ مالِ غنیمت میں اپنا حصّہ زیادہ لیتے ہیں، خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر دیا ہے اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔ اس لیے مجھ کو غیرت آنے کا زیادہ حق ہے۔"

اس تقریر میں برسرِ اقتدار قوت اور اس کے حامیان کے خلاف الزام یہ ہیں کہ:

۱۔ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی۔ ۲۔ رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی۔ ۳۔ مُلک میں فساد پھیلایا۔ ۴۔ حدودِ الٰہی کو معطل کر دیا۔ ۵۔ مالِ غنیمت میں ناجائز تصرف کیا۔ ۶۔ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کیا۔ ۷۔ خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کیا۔

یہ ساری باتیں قرآن و سنّت کے عین مطابق ہیں اور اس میں نہ امامت سے کوئی جداگانہ لگاؤ کا رنگ ہے اور نہ کسی طرح کی نئی اور علیحدہ اصطلاحات ہیں۔

بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت کی بحالی اور نفاذِ شریعت حقّہ کا جذبہ تھا۔ جس کا اظہار امام کے متذکرہ خطبے میں ہوا۔

قیس بن اشعث کو جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"خدا کی قسم! میں ذلیل کی طرح اس کے ہاتھوں میں ہاتھ نہ دوں گا اور غلام کی طرح اس کا (یعنی اس کی حکمرانی کا) اقرار نہیں کروں گا۔"

مطلب واضح ہے کہ لشکر کے دباؤ سے میں ذلت کی راہ اختیار کر کے ایک غلط حاکم کی بیعت

کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اور نہ ان کی حکومت کے جواز کا غلامانہ انداز سے اقرار کر سکتا ہوں۔
شبِ عاشورہ کو جب بہن زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت بے قابو ہو کر روئیں تو آپ سے فرمایا:

"میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو اُسوۂ رسولؐ کے خلاف نہ کرنا، میری موت پر گریبان نہ پھاڑنا، منہ نہ نوچنا اور بَین نہ کرنا۔"

یہ وصیت بے حد اہم ہے اور ہم مسلمانوں کو اسے اپنے ذہنوں میں تازہ کرنا چاہیے۔

اجمالاً ہم نے یہاں امام حسینؓ کے پیغام اور مقصدِ قربانیٔ کربلا کو بیان کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مختصر سی تحریر اہلِ ایمان کے لیے باعثِ افادہ ہوگی۔

جاننا چاہیے کہ آج جب کہ دُنیا کی طاغوتی قوتیں محض مقتدر اشخاص اور حاکم خاندانوں تک محدود نہیں رہ گئی ہیں۔ بلکہ یہ بدیت عالمگیر قوتوں کی صورت میں وہی سارے کام کر رہی ہیں، جن کے خلاف حضرت امام حسین جان کی بازی لگانے اُٹھے تھے۔ جبر سیاسی بھی، معاشی بھی، سفارتی بھی اور جنگی بھی، — ہر طرف کارفرما ہے، فحاشی و عیاشی کا سیلاب اُمڈ رہا ہے۔ جھوٹے اور فریبکارانہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا ہے، خدا کے حرام کردہ اُمور کو حلال اور حلال کردہ کو حرام کر دیا گیا ہے — شیطٰن کی اطاعت ہو رہی ہے اور رحمٰن سے بغاوت، بر و بحر میں فساد ہی فساد ہے، زمین خوف کی بے شمار اقسام سے بھر گئی ہے، حدودِ الٰہی معطل ہی نہیں، ان کے خلاف عقلی حملوں کے علاوہ طنز و تضحیک کے وار بھی ہو رہے ہیں۔ انسانی معاشروں کے اموال میں ہر جگہ تصرفِ بے جا ہو رہا ہے۔ خود مسلمان ممالک میں خدا کے عہد کو توڑنے اور سنّتِ رسولؐ کی مخالفت کرنے میں اربابِ جاہ و مال اور اصحابِ فکر و دانش کے ساتھ عوام بھی شریک ہیں۔ ہمارے اِردگرد اتنا بڑا میدانِ کربلا پھیلا ہوا ہے اور اس سے کبھی کبھی آواز آتی ہے:

"ایک حسین بھی نہیں"

غلاظت کے اس طوفانی سمندر کی موجوں اور گردابوں میں گھرے ہوئے سچے مسلمانوں کا کام

یہ ہے کہ باہم مل کر اور قوتیں جمع کرکے اس عذاب سے باہر نکل کر کسی جزیرۂ سلامتی تک پہنچنے کی راہ نکالیں۔ نہ یہ کہ موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے وہ آپس ہی میں لڑنے لگیں۔[۱]

دعا ہے کہ یہ زمانۂ محرم خیریت سے گذرے اور مسلمان امام حسینؓ کی قربانی کے صحیح مقصد اور ان کے دیئے ہوئے پیغام کو سمجھیں۔

ایک ضروری وضاحت:

چونکہ یہ اشارات مجھے ایک ہی دن میں لکھنے تھے اس لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کا موقع نہ تھا۔ متذکرہ حوالے میں نے سیر الصحابہ جلد ۶ (شائع کردہ دار المصنفین) سے لیے ہیں۔

---

[۱] امام حسینؓ کا قائم کردہ نمونہ یہ ہے کہ انہوں نے ساتھ نہ آسکنے والوں کے عذر سن کر بھی ملامت نہیں کی اور ساتھ آنے والوں کو دیدہ دیکھ کر کہ اب فتح و شکست کا معاملہ نہیں بلکہ سارا کھیل محض جانیں دینے کا ہے، واپس جانے کی بار بار ترغیب دلائی اور جو چلے گئے ان کے ایمان یا کردار کے خلاف کوئی سخت لفظ استعمال نہیں کیا۔ یہ تو بعد کے لوگ ہیں جنہوں نے جس کے متعلق جو چاہا کہہ دیا۔ اور اسی سے نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔